بحث ونظر

جناب مولانا محمد طاسین صاحب، مجلس علمی کراچی

کیا بنکاری کا نیا نظام اسلامی ہے؟

عُلماء کرام کے لئے توجہ طلب مسئلہ

پاکستان میں اسلامی نظام معیشت کے قیام کے سلسلہ میں بنکاری نظام کی کچھ نئی صورتیں (پی ایل ایس وغیرہ) قائم کی گئی ہیں اور بعض صورتوں کے مطابق نظام بنکاری کو عنقریب تبدیل کرنے کے اعلانات ہو رہے ہیں۔ بعض ماہرین علماء کو موجودہ شکل کے اسلامی ہونے پر بھی اطمینان نہیں۔ اور اس کو صحیح اسلامی خطوط پر ڈالنے کی تجاویز بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔ ملک کے ممتاز عالم مولانا محمد طاسین صاحب جنہیں معاشیات کے موضوع سے خاص شغف ہے اس موضوع پر اظہار خیال فرماتے ہیں۔ ادارہ الحق اس سلسلہ میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے ملک کے علماء اور ماہرین معاشیات سے اپیل کرتا ہے کہ اس موضوع پر ٹھوس اور تحقیقی انداز میں اظہار خیال فرمائیں الحق کے صفحات حاضر ہیں۔ (ادارہ)

اس توجہ طلب مسئلہ سے میری مراد وہ مسئلہ ہے جو پاکستان میں نظام بنکاری کی اس نئی شکل کے حوالے سے وجود میں آیا ہے جس کے مطابق عنقریب موجودہ نظام بنکاری کو تبدیل کیا جانے والا ہے۔ کہ نظام بنکاری کی یہ نئی متبادل شکل غیر سودی اور اسلامی ہے۔ باوجودیکہ موجودہ رائج شکل جسے سودی اور غیر اسلامی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور قائم کی جانے والی نئی متبادل شکل میں کوئی حقیقی، جوہری اور بنیادی فرق نہیں۔ دونوں اپنے اجزائے ترکیبی، اصول وقواعد اغراض ومقاصد اور اپنے عملی اثرات ونتائج میں برابر ویکساں ہیں۔ اگر کسی چیز کا محض نام بدل دینے اور الفاظ کے تغیر و تبدل سے اس چیز کی حقیقت اور خاصیت بدل سکتی اور اس کا شرعی حکم مختلف ہو سکتا ہے تو پھر بنکاری کی یہ نئی متبادل شکل بھی غیر سودی اور اسلامی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ زہر کو تریاق کہنے سے زہر تریاق اور سیاہ کو سفید کہنے سے سیاہ سفید بن گیا ہو لہذا جو معاملہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے ربوٰ اور سود ہے اسے شرکت اور مضاربت کہہ دینے سے کبھی شرکت و مضاربت نہیں بن سکتا۔ اور نہ وہ حرام سے حلال ہو سکتا ہے

بہرحال جہاں تک میرے مطالعے اور علم وفہم کا تعلق ہے میں نظام بنک کاری کی نئی مجوزہ شکل کو بھی سودی اور غیر اسلامی سمجھتا ہوں۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ اپنے نتائج واثرات کے لحاظ سے بڑا اہم اجتماعی مسئلہ ہے لہذا میری گذارش ہے کہ محقق علماء کرام اس کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ اور اس کے تمام پہلوؤں کا تحقیقی اور تفصیلی جائزہ لے کر قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے یہ فیصلہ کریں کہ بنک کاری کی یہ جو نئی مجوزہ متبادل شکل ہے غیر سودی اور اسلامی ہے یا سودی اور غیر اسلامی؟ اگر اجتماعی فیصلہ اس کے سودی اور غیر اسلامی ہونے کا ہو تو پھر اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی خاطر اس کا اظہار واعلان کیا جائے تاکہ مسلمان سودی کو غیر سودی اور حرام کو حلال سمجھنے کے دھوکے اور مغالطے سے بچ جائیں۔ اور اسلام کے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہ ہو۔ جس سے اس کی عظمت شان پہ کوئی حرف آسکتا ہو۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر اس نئے متبادل نظام بنک کاری کو غیر سودی اور اسلامی کے نام سے نہ پیش کیا جاتا تو نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا اور نہ علماء کو اس کا نوٹس لینے، اُس کی طرف توجہ دینے اور اس پر بحث وتحقیق کرنے کی زحمت اٹھانی پڑتی۔ آخر موجودہ نظام بنک کاری بھی تو ایک زمانہ سے قائم اور چل رہا ہے۔ علماء نے کب اس کے خلاف احتجاج بلند کی۔ اور اسے ایک مسئلہ بنایا۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ اس نئے مجوزہ نظام بنکاری کو پورے زور وشور کے ساتھ غیر سودی اور اسلامی کے عنوان سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ جو حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط ہے۔ اور پھر اس غلط بیانی کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا اگر نظام بنک کاری میں اس نئی تبدیلی سے یہ توقع ہوتی کہ اس کے ذریعے معاشرے کی موجودہ معاشی حالت میں خوشگوار تغیر وتبدل ظاہر ہوگا۔ اور اس معاشی ناہمواری اور اقتصادی اونچ نیچ میں کچھ کمی نمودار ہوگی جو اس وقت ہمارے معاشرے میں تشویشناک حد تک پائی جاتی اور بکثرت معاشرتی برائیوں کا باعث ہے۔ بالفاظ دیگر اس تبدیلی سے عام آدمی کی معاشی پریشانی کچھ کم ہو کر اسے فائدہ پہنچے گا۔ اور اس کی معاشی حالت بہتر ہوگی۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی ہے جس میں کسی ایسی توقع کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس کے بعد بھی معاشی صورت حال ویسی ہی رہتی ہے جیسی اس وقت موجود ہے۔ بنکوں سے تعلق رکھنے والی دولت کی گردش انہی لوگوں تک محدود رہتی ہے جن تک اس تبدیلی سے پہلے محدود ہے۔ جس طرح موجودہ نظام بنک کاری سے ایک طرف اُن کھاتہ دار افراد کو فائدہ پہنچتا ہے جو ضرورت سے زائد مال رکھتے اور اسے مزید بڑھانے کی غرض سے بنک کو دیتے ہیں اور دوسری طرف اُن متمول کاروباری لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جو اپنے تمول میں اضافہ کرنے کے لئے بنک سے سودی قرضے لیتے اور کاروبار چمکاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس نئے متبادل نظام بنک کاری کا فائدہ بھی انہی مذکورہ دو قسم کے لوگوں تک محدود رہتا ہے۔ ایک عام آدمی جو اپنے پاس بنک میں کھاتہ کھولنے کے لئے ضرورت سے زائد مال نہیں رکھتا۔ یا جو ناداری کی وجہ سے بنک سے قرضہ نہیں لے سکتا ظاہر ہے کہ اسے اس متبادل نظام بنک کاری سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور

چونکہ ایسے افراد کی تعداد معاشرے میں نوے فیصد سے کم نہیں۔ لہٰذا یہ تبدیلی معاشرے کی عظیم اکثریت کے لئے بیکار اور غیر مفید ثابت ہو کر رہے گی۔

غرضیکہ اس میں بہی خواہانِ اسلام کے لئے تشویش و فکر مندی کا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے نام پر کی گئی اس تبدیلی سے جب معاشرے کی موجودہ معاشی حالت میں کوئی خوشگوار تغیر رونما نہ ہوگا اور عام آدمی کی معاشی پریشانی میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی تو مخالف اسلام سوشلسٹ قسم کے لوگوں کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا غنیمت موقع ملے گا اور وہ جاہل عوام کو اسلام سے متنفر کرنے کے لئے کہیں گے کہ اسلام کا معاشی نظام بھی بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہے۔ جو غریب عوام کے مقابلہ میں سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتا اور ان کی بہتری اور ترقی چاہتا ہے۔ سوائے صدقہ و خیرات کے اس کے پاس معاشی لحاظ سے پس ماندہ غریب عوام کے لئے اور کچھ نہیں تم نے دیکھ لیا اسلام کے نام سے یہاں معاشی رد و بدل ہوا اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں سوشلزم کا مقصد تمہاری معاشی حالت بہتر بنانا اور تمہارے لئے ترقی کے مواقع مہیا کرنا ہے۔ اور اس کا روشن ثبوت وہ معاشی حالات ہیں جو سوشلسٹ ممالک کے اندر عملی طور پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً وہاں ہر ایک کے لئے غذا، لباس، مکان اور مفت تعلیم اور علاج کا انتظام ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے پروپیگنڈے سے غریب عوام کا متاثر ہونا اور پھر اسلام سے دور اور سوشلزم کے قریب ہو جانا ایک قابلِ فہم اور قدرتی امر ہے۔ نیز اس سے اسلام کی نیک نامی پر مضر اثر پڑنا بھی قدرتی بات ہے۔ بنا بریں ضروری ہو جاتا ہے کہ علماء کرام اسلام کے نام سے کی جانے والی اس قسم کی فضول معاشی تبدیلیوں کا نوٹس لیں اور ان کی صحیح شرعی حیثیت واضح کر کے مسلمانوں کو اس کے مضرات و نقصانات سے آگاہ کریں۔ اور اگر تساہل وغیرہ کی وجہ سے علماء کرام ایسا نہیں کرتے اور خاموش رہتے ہیں تو آگے چل کر اس کے بُرے نتائج و عواقب سامنے آئیں گے۔ اُن کا بہت بڑی حد تک علماء کرام کو ذمہ دار گردانا جائے گا۔ اور انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

راقم الحروف اپنے علماء کرام کے سامنے نظام بنک کاری کی نئی متبادل شکل کی تفصیلی وضاحت سے پہلے ایک بات اپنے اربابِ اقتدار کی خدمت میں بھی اخلاص و دردمندی کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آج اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مابین نزاع و کشمکش کے نتیجہ میں دنیا بھر کے اندر عموماً اور ہمارے اردگرد خصوصاً جو حالات پائے جاتے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان میں اسلام کے نام سے جو معاشی اصلاحات تجویز کریں اور جو تبدیلیاں عمل میں لائیں وہ ایسی ہونی چاہئیں جن سے نچلہ درجہ کے پس ماندہ عوام کی معاشی حالت بہتر بن سکتی اور اس غیر فطری معاشی نشیب و فراز اور اونچ نیچ میں کچھ کمی آسکتی ہو۔ جو اس وقت ہمارے پاکستانی معاشرے میں موجود اور بے شمار معاشرتی سیاسی اور ثقافتی برائیوں اور اخلاقی بدعنوانیوں کا سبب اور منبع ہیں۔ اور جس کے ہوتے ہوئے معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کی تمنا و آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اور معاشرے کو صحیح معنوں میں اسلامی بنانے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر

نہیں ہوسکتا۔ ایسی معاشی اصلاحات اور تبدیلیوں سے ہمیں احتراز برتنا چاہئے جو جزوی اور سطحی قسم کی ہوں اور جن کا فائدہ عظیم اکثریت کی بجائے ایک معمولی اقلیت کو پہنچتا اور دولت مند لوگوں کی دولت و ثروت میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہوں۔ دیکھا جائے تو نظام بنک کاری میں مجوزہ تبدیلی اور اصلاح بھی اسی قسم کی ہے جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بلاشبہ ایک اسلامی معاشرے سے ربٰو و سود کا ختم کرنا ازبس ضروری ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے یہ جاننا اور متعین کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ربٰو اور سود کی حقیقت اور اس کے حرام ہونے کی علّت کیا ہے اور کیا نہیں؟ اور یہ کہ جس ظلم و استحصال کی وجہ سے ربٰو کو قرآن و حدیث نے حرام ٹھہرایا ہے وہ نظام بنک کاری کے علاوہ معاشی کے دوسرے شعبوں مثلاً تجارت، صنعت اور زراعت میں کہاں کہاں اور کن کن شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لئے جو اسلام کے مطابق معاشرے کی اصلاح کرنا اور اس کے اندر معاشی تبدیلیاں عمل میں لانا چاہتے ہوں اس حکمت عملی اور حکیمانہ طریق کار کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ جیسے ایک فاسد اور بگڑے معاشرے کی اصلاح کے سلسلہ میں پوری طرح ملحوظ و مدنظر رکھنے کی اسلام میں تعلیم اور تاکید ہے اور جس کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بگڑے معاشرے کی بتدریج اصلاح فرما کر اس کا پورا ڈھانچہ بدلا۔ اور امت مسلمہ کو یہ سبق دیا کہ اس کے مصلحین جب بھی کسی بگڑے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہیں تو میری اس حکمت عملی اور سنّت کو پوری طرح سامنے رکھیں اور اس کے مطابق اصلاحی تبدیلیاں عمل میں لائیں تاکہ جو اصلاحی تبدیلی عمل میں آئے استحکام و پائیداری کے ساتھ قائم رہے اور مخالف ردعمل سے اس کا فائدہ، نقصان سے نہ بدلے جو ہمیشہ فائدہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوا کرتا ہے۔

جہاں تک میرے مطالعہ اور علم و فہم کا تعلق ہے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ماہرین اقتصادیات کے پینل نے بلاسود بنک کاری سے متعلق جو رپورٹ مرتب کی اور کتابی شکل میں سامنے آئی ہے اس میں نہ ربٰو اور سود کی حقیقت کو کما حقہٗ سمجھا گیا اور نہ اس علّت کو جس کی وجہ سے ربٰو و سود حرام ہے۔ دراصل اس سلسلہ میں جس غیر معمولی مطالعے غور و فکر اور ریسرچ و تحقیق کی ضرورت تھی۔ غالباً پینل کی اکثریت کو اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کا پورا موقع نہیں مل سکا۔ اور اگر کچھ ممبروں کو اس کا موقع ملا تو افسوس کہ ان کی آرا کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا اور نظرانداز کر دیا گیا جیسے محترم شیخ محمود احمد کی رائے کو جو اسلامی نقطۂ نظر سے درست اور صائب رائے تھی اور جو اس رپورٹ کے ساتھ نہیں بلکہ بعد میں الگ شائع ہوئی۔ اور اخبار جسارت کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ بہرحال مجھے اُن حضرات کی نیک نیتی اور اسلام دوستی کے بارے میں شک و شبہ نہیں۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی ان کی علمی قابلیت کا بھی اعتراف ہے۔ لیکن جہاں تک ربٰو کی حقیقت اور اس کے حرام ہونے کی علّت کا تعلق ہے اس کے صحیح شعور و ادراک سے یہ حضرات قاصر رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں ان کی توجہ نظری سے زیادہ عملی پہلو پر رہی اور انہوں نے اس فرق کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا جو نظریے اور اس کی تطبیق کے مابین

ہوتا ہے نیز انہوں نے اس غور و فکر میں معروضی سے زیادہ موضوعی طریقہ سے کام لیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اس کا زیادہ خیال رکھا کہ مسئلے کا حل ایسا ہونا چاہیئے جو معاشرے کے موجودہ حالات میں قابل عمل ہو۔ لیکن اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ اس سے وہ عملی نتائج بروئے کار آسکتے ہیں یا نہیں۔ بروئے کار لانا اسلام کا اصل مقصود ہے۔

اب میں اس نئے متبادل نظام بنک کاری کی کچھ تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی شرعی حیثیت کا تعین آسانی کے ساتھ کیا جا سکے:۔

اس کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ بنک کا یہ ادارہ کوئی ایسا تعاونی اور رفاہی ادارہ نہیں جس کا مقصد بغیر کسی مادی معاوضے کے محض اللہ کی رضا اور اخروی اجر و ثواب کی خاطر خلق خدا کی خدمت کرنا اور اسے فائدہ پہنچانا ہو بلکہ یہ ایک کمرشل اور تجارتی ادارہ ہے جس کا مقصد دولت کمانا اور اپنے تمول کو بڑھانا ہے۔ دوسرے کمرشل اداروں اور اس کمرشل ادارے کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ تجارت، صنعت اور زراعت وغیرہ کے کام کر کے نفع کماتے ہیں اور یہ زر و نقدی کے لین دین کے ذریعہ نفع کماتا ہے یعنی کم معاوضے پر کچھ لوگوں سے زر و نقدی لینا اور زیادہ معاوضے پر دوسرے لوگوں کو زر و نقدی دینا اور اس کمی و بیشی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے موجودہ نظام بنک کاری اور اس متبادل مجوزہ نظام بنک کاری میں کچھ فرق نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ نظام بنک کاری کے لئے بھی یہی طے پایا ہے کہ اس کے لین دین کی قانونی حیثیت واجب الادا قرض کی ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتا اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس میں بھی یہی طے کیا گیا ہے کہ بنک اپنے کھاتہ داروں کو نفع کے نام پر جو زائد دے گا یا اپنے قرض داروں سے جو زائد لے گا اس کا تعین وقت اور مال کی مقدار اور کمی بیشی کے لحاظ سے ہوگا۔ مثلاً سو روپے والے کھاتہ دار کے لئے ایک سال میں دس روپے زائد ہوں گے۔ تو چھ ماہ میں پانچ روپے اور دو سال میں بیس روپے زائد ہوں گے۔ اسی طرح اگر سو روپے والے کھاتہ دار کے لئے مثلاً سالانہ دس روپے زائد ہوں گے تو دو سو والے کے لئے سالانہ بیس پانچسو والے کے لئے سالانہ پچاس اور ہزار والے کھاتہ دار کے لئے سالانہ سو روپے زائد ہوں گے اور یہ طے پایا ہے۔ کہ اس زائد کے تعین کا اختیار فریقین معاملہ کو نہیں بلکہ اسٹیٹ بنک کو ہوگا۔ نیز یہ بھی طے پایا ہے کہ زائد کی ادائیگی معاملے کے اختتام پر نہیں بلکہ دوران معاملہ ہر چھ ماہ بعد ہوتی رہے گی۔ اسی طرح چونکہ اس میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ بنک کھاتہ دار کو اور قرضدار بنک کو ہر حال میں اس کی اصل رقم مع مقررہ اضافہ کے ضرور ادا کرے گا۔ لہذا معاہدہ کی رُو سے کھاتہ دار اور بنک دونوں کے لئے نقصان کا سرے سے کوئی احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر جس طرح موجودہ نظام بنک کاری کے اندر کھاتہ دار کو بغیر کسی کام و محنت کے اور کوئی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کے اصل پر کچھ زائد کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح نئے مجوزہ نظام بنک کاری کے اندر بھی کھاتہ دار کو بغیر کسی کام و عمل کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی

ذمہ داری کے اصل پر نائد کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی طریقہ سے مجوزہ نظام بنک کاری میں بھی یہ اصول مقرر ہے کہ بنک صرف ایسے کاروباری لوگوں کو قرضہ دے گا۔ جن کے متعلق اسے وثوق و اعتماد ہو گا۔ کہ وہ کاروباری تجربہ، فنی مہارت اور دیانتداری کے ساتھ مالی طور پر ادائیگی کی صلاحیت رکھتے اور لئے ہوئے قرضہ کو بہتر اور مفید طور پر استعمال کر سکتے ہیں بالفاظ دیگر جن کے متعلق اسے پورا اعتماد ہو گا۔ کہ وہ قرض کی اصل رقم بھی ضرور واپس کریں گے۔ اور منافع کا طے شدہ حصہ بھی ضرور ادا کریں گے بلکہ اس نئے بنک کے لئے یہ بھی طے پایا ہے کہ وہ اپنے مقروض کاروباری لوگوں کے کاروبار پر برابر نگاہ رکھے گا۔ اور اپنے نمائندوں کے ذریعے مسلسل جائزہ لیتا اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرتا رہے گا۔ بلکہ وہ اس میں ہر ایسی مداخلت کا مجاز ہو گا جس سے اصل سرمائے کے کامل تحفظ کے ساتھ مطلوبہ منافع کا حصول یقینی ہو سکتا ہو۔ بنا بریں اس نئے مجوزہ نظام بنک کاری میں بنک کے مفاد کے لئے جو قانونی تحفظات ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جو موجودہ نظام بنک کاری میں مفاد بنک کے لئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی طے ہے کہ نئے نظام بنک کاری میں بنک اپنے مقروض کاروباری فریق کے متعلق کوئی ایسی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا جس سے اس کے اصل مال اور مطلوبہ منافع میں کمی و نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہو۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نئے نظام میں بھی بنک کے لئے قرضدار کی طرف سے نفع کے نام پر جو زائد لینا قرار پایا ہے اس کے عوض بنک کی طرف سے کوئی ایسا کام و عمل موجود نہیں جسے پیدا آور کام و عمل کہا جا سکتا ہو۔ بنک کا عملہ جو کام کار کرتا ہے وہ ایسا پیدا آور کام نہیں ہوتا جیسا کہ ایک کاشتکار، صانع اور تاجر وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

سطور بالا میں نئے مجوزہ نظام بنک کاری کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نظام میں بنک کے معاملہ کی جو شکل کھاتہ داروں کے ساتھ اور جو شکل کاروباری قرضداروں کے ساتھ تجویز کی گئی ہے وہ نہ شرعی طور پر مضاربت کی شکل ہے اور نہ معاملہ شرکت کی شکل۔ یعنی نہ مضاربت کی تعریف میں آتی ہے اور نہ شرکت کی تعریف میں۔ جن وجوہ کی بنا پر معاملہ مضاربت کی تعریف میں نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس میں بنک کی حصہ دار سے جو مال لیتا اور کاروباری فریق کو جو مال دیتا ہے اس کی حیثیت واجب الادا قرض کی ہے۔ جب کہ مضاربت میں ایک فریق کا مال دوسرے فریق یعنی عامل مضارب کے پاس بطور امانت کے ہوتا ہے۔ شریعت کی رو سے قرض اور امانت کے درمیان جو وجوہ فرق ہیں اُن میں سے ایک یہ کہ قرض میں مال مُقرض کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت میں چلا جاتا ہے چنانچہ وہ اس میں ہر وہ تصرف کر سکتا ہے جو اپنے کسی دوسرے مال میں کر سکتا ہے۔ جب کہ امانت کی صورت میں مال، مال والے ہی کی ملکیت میں رہتا اور امین اس میں کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا جس کی مالک کی طرف سے اجازت نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر قرض کا مال کسی سبب سے ضائع اور تلف ہو جائے تو وہ مقروض کے حق میں ضائع و تلف ہوتا اور اس کا پورا نقصان تنہا اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ مُقرض اس نقصان میں بالکل شریک نہیں ہوتا جب کہ اس کے برخلاف مال امانت اگر محافظ امانت کے پاس کسی غیر اختیاری سبب مثلاً ارضی و سماوی آفت وغیرہ سے تلف اور ضائع ہو جائے

تو اس کا ضمان و تاوان محافظ امانت پر نہیں آتا بلکہ پورا نقصان مالک امانت کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ وہ اسی کی ملکیت میں ہوتا ہے۔

اور چونکہ مضاربت میں مال مضاربت، عامل مضارب کے پاس بطور امانت ہوتا ہے لہٰذا اصل مال میں نقصان ہو جائے تو وہ نقصان پورے کا پورا ربّ المال کے حساب میں آتا ہے عامل مضارب اس میں شریک نہیں ہوتا۔ پھر یہی وجہ ہے کہ عامل مضارب اپنے تصرفات میں ان شرائط کا پابند ہوتا ہے جو ربّ المال کی طرف سے انعقاد معاملہ کے وقت مقرر کی گئی ہوتی ہیں۔

رہی یہ بات کہ بنک کے پاس کھاتہ دار کا اور کاروباری فریق کے پاس بنک کا جو مال ہوتا ہے بطور امانت نہیں بلکہ بطور قرض ہوتا ہے اس کا بیّن اور قطعی ثبوت یہ ہے کہ یہ مال بنک کے ذمے کھاتہ دار کے لئے اور کاروباری فریق کے ذمے بنک کے لئے پورے کا پورا واجب الادا ہوتا ہے جو عند الطلب اسے ضرور ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جو مال، لینے والے پر دینے والے کے لئے پورے کا پورا واجب الادا ہوتا ہے وہ عرفاً، شرعاً، اور قانوناً قرض ہی کی تعریف میں آتا ہے اور اس کا نام خواہ کچھ بھی رکھا جائے وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے قرض ہوتا ہے۔ ایسا مال امانت کی تعریف میں اس لئے نہیں آتا کہ امانت کا مال اس صورت میں واجب الادا نہیں ہوتا جب کسی غیر اختیاری سبب سے ضائع و تلف ہو جائے، حالانکہ قرض کا مال بہر صورت واجب الادا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں امانت کی حفاظت پر امانت والا، محافظ کو اپنے پاس سے کچھ دیتا ہے نہ کہ الٹا اس سے کچھ لیتا ہے۔ اسی طرح یہ مال، مال اجارہ کی تعریف میں بھی نہیں آتا۔ کیونکہ مال اجارہ صرف وہ مال ہو سکتا ہے جو استعمال ہونے سے گھستا، فرسودہ ہوتا اور قدر و قیمت میں گھٹتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محض استعمال ہونے سے زر و نقدی کی قدر و قیمت میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کے استعمال پر کوئی کرایہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری چیز جس کی وجہ سے بنک کا معاملہ مذکور مضاربت کی تعریف میں نہیں آتا یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ بنک اپنے کھاتہ دار کو اور کاروباری فریق بنک کو نہ صرف یہ کہ اس کی اصل رقم ضرور ادا کرے گا بلکہ اصل پر کچھ زائد بھی ضرور ادا کرے گا۔ حالانکہ مضاربت میں عامل مضارب، ربّ المال سے ایسا کوئی عہد و پیمان نہیں کر سکتا کہ معاملہ ختم ہونے پر وہ اس کو پورے اصل کے ساتھ کچھ زائد بھی ضرور دے گا ورنہ تو پھر ربٰوا اور مضاربت کے درمیان کچھ فرق ہی باقی نہیں رہتا۔

تیسری چیز جو بنک کے معاملہ مذکور کو مضاربت کی تعریف سے خارج کر دیتی ہے یہ کہ اس میں بنک کی طرف سے کھاتہ دار کے لئے اور بنک سے قرض لینے والے کاروباری فریق کی طرف سے بنک کے لئے نفع کے نام سے جو زائد مقرر کیا گیا ہے وہ مال اور وقت کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے مقرر کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ یعنی اس میں زائد کے تعین کا معیار مال اور مدت کی مقدار اور کمی و بیشی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ حالانکہ مضاربت میں یہ طے پاتا ہے کہ اگر

نفع ہوا تو اس صورت میں وہ رب المال اور مضارب کے مابین نسبتی حصہ سے تقسیم ہوگا۔ مثلاً نصف نصف یا ایک کو تہائی اور دوسرے کو دو تہائی یا ایک کو چوتھائی اور دوسرے کو تین چوتھائی وغیرہ اس میں کسی فریق کے لئے تعداد و مقدار کے لحاظ سے متعین رقم مقرر کرنا جائز نہیں ہوتا اور ایسا کرنے سے معاملہ فاسد و باطل ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ مضاربت میں مال والے فریق کے لئے نفع کا تعین مال کی مقدار اور مدت کی مقدار سے نہیں ہوتا بلکہ نفع کے ایک مفسدہ نسبتی حصہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ لہٰذا بعض دفعہ کم مقدار کے مال پر تھوڑے وقت میں اسے اتنا زیادہ نفع مل جاتا ہے کہ دوسری دفعہ اس سے کئی گنا زیادہ مال پر اور طویل وقت میں بھی اتنا نہیں ملتا۔ اور بعض دفعہ سرے سے کچھ ملتا ہی نہیں اور کبھی زیادہ تو درکنار الٹا اصل میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ مثلاً کبھی رب المال کو ایک ہزار روپے پر ایک ماہ میں اتنا زیادہ مل جاتا ہے کہ دوسری دفعہ دس ہزار روپے پر بھی اتنا نہیں ملتا۔ چنانچہ یہ زائد نفع کبھی اصل مال کا ایک فیصد بھی ہو سکتا ہے کبھی پانچ فیصد اور کبھی پچاس فیصد بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ ایک ہفتہ میں بھی ہو سکتا ہے اور ایک ماہ اور ایک سال میں بھی۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر مضاربت میں نسبتی حصہ کی بجائے رب المال کے لئے اس کے سرمائے کے فیصد وغیرہ کے لحاظ سے متعین رقم مقرر کر دی جائے تو یہ مضاربت باطل ہو جاتی ہے۔

چوتھی چیز جو معاملہ زیر بحث کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہے یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ کاروبار کے اندر نقصان کی صورت میں کاروباری فریق بھی نقصان میں شریک ہوگا۔ حالانکہ مضاربت میں یہ متفقہ امر ہے کہ بصورت خسارہ و نقصان، پورا خسارہ اور تمام تر نقصان رب المال یعنی مال والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ عامل مضارب یعنی کام کرنے والا فریق اس میں بالکل شریک نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر اس کو اس میں شریک ٹھہرایا جائے تو مضاربت باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

پانچویں چیز جس کی وجہ سے معاملہ مذکور مضاربت کا مصداق نہیں ٹھہرتا یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ کھاتہ دار کو دوران معاملہ ہر چھ ماہ کے بعد مقررہ منافع دیا جاتا رہے گا۔ جب کہ فقہاء حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ مضاربت میں فریقین کے درمیان منافع کی تقسیم اختتام معاملہ پر ہی ہو سکتی ہے۔ معاملہ قائم اور جاری رہتے ہوئے درمیان میں نہیں ہو سکتی۔

ان مذکورہ وجوہ کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ جن کی بنا پر معاملہ زیر بحث، مضاربت صحیحہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ جیسے مال مضاربت کو تجارت بمعنے خرید و فروخت کے علاوہ صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ میں لگانا رب المال کی اجازت کے بغیر اس کے سرمائے کے ساتھ اپنا سرمایہ بھی شریک کر لینا یا دوسرے کسی کو مضاربت پر دے دینا، عامل مضارب کا خرید و فروخت کا اصل کام کرنے کی بجائے کسی اور سے اجرت پر کرانا وغیرہ لیکن چونکہ ان وجوہ کے متعلق خود فقہاء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے لہٰذا انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اسی طرح معاملۂ مذکور شرکت کا معاملہ بھی نہیں۔ شرکت اور مضاربت کے مابین شرعی طور پر جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ مضاربت میں ایک فریق کا مال ہوتا ہے۔ اور دوسرے فریق کا تجارتی کام وعمل جب کہ شرکت الاموال میں ہر فریق کا مال بھی ہوتا ہے اور کام وعمل بھی۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ نقصان کی صورت میں مضاربت کے اندر پورا نقصان مال والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کام وعمل والا فریق اس میں شریک نہیں ہوتا۔ جب کہ معاملۂ شرکت میں دونوں فریق نقصان میں بھی شریک اور حصہ دار ہوتے ہیں۔

جن وجوہ کی بنا پر بنک کا وہ معاملہ جس کی پہلے تفصیل کے ساتھ شکل پیش کی گئی ہے شرکت کا معاملہ نہیں اُن میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک فریق کا نہ تجارتی کام وعمل ہے اور صنعتی کام وعمل، یعنی کھاتے دار کا سرے سے کوئی کام وعمل ہے ہی نہیں۔ جہاں تک بنک کا تعلق ہے اس کے اسٹاف اور عملے کا ضرور کام وعمل ہے لیکن وہ انتظامی نوعیت کا ہے۔ براہِ راست تجارتی اور صنعتی کام وعمل نہیں۔ تجارتی اور صنعتی کام وعمل صرف ان لوگوں کا ہے جو بنک سے مال قرض لے کر تجارتی اور صنعتی کاروبار کرتے ہیں۔

دوسری وجہ اس معاملے میں شرکت کا معاملہ نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس میں ایک فریق کا مال دوسرے کے پاس بطور قرض ہوتا ہے جب کہ معاملۂ شرکت میں کسی شریک کا مال دوسرے کے پاس قرض نہیں ہوتا بلکہ امانت کی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ ضائع وتلف ہو جانے کی صورت میں کسی پر تاوان نہیں آتا۔

تیسری وجہ یہ کہ اس میں ایک فریق یعنی بنک کھاتہ دار کو اور کاروباری فریق بنک کو یقین اور اطمینان دلاتا اور ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ ایک متعین مقدار میں اس کو نفع ضرور مہیا کرے گا حالانکہ معاملۂ شرکت میں کوئی شریک دوسرے شریک کو کوئی ایسی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ اسے ایک متعین مقدار میں نفع ضرور مہیا کرے گا۔

چوتھی وجہ اس کے شرکت نہ ہونے کی یہ کہ اس میں ایک فریق کے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ اس کو اس کے سرمائے کے فیصد کے حساب سے سالانہ آٹھ یا دس فیصد زائد بطورِ نفع ملے گا جب کہ معاملۂ شرکت میں یہ طے ہوتا ہے کہ اگر نفع ہوا تو شرکاء کے مابین اس نسبتی حصہ کے مطابق تقسیم ہوگا جو شروع میں ان کے درمیان باہمی رضامندی سے طے پایا تھا۔ یعنی نصف نصف یا ایک تہائی اور دو تہائی وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز شرکت کے منافی ہے کہ اس میں ایک شریک کے لئے اس کے سرمائے کی مقدار کے لحاظ سے اور وقت کے پیمانے سے نفع کا تعین کیا جائے۔

بہرحال فقہاء اسلام کے نزدیک شرکۃ العقد اور شرکۃ المعاملہ کی جو معنوی حقیقت اور اصطلاحی تعریف ہے اس کی رو سے بنک کا معاملۂ مذکور شرکت کے تحت نہیں آتا۔ نہ شرکت اموال کے تحت اور نہ شرکت وجوہ اور شرکت ابدان وشرکۃ الصنائع کے تحت۔ اسی طرح نہ وہ شرکۃ العنان کا مصداق ہے اور نہ شرکۃ المفاوضہ کا مصداق، لہٰذا اس معاملے کو نفع ونقصان میں شرکت کا معاملہ کہنا۔ لغتہً درست ہو تو ہو لیکن شرعاً کسی طرح درست

نہیں، اور پھر چونکہ اس کہنے سے ایک عام مسلمان کو جو شرکت کا شرعی مفہوم نہیں جانتا شرکت کا دھوکہ لگتا ہے اور وہ اسے شرعی شرکت سمجھ کر اختیار کرتا اور گمراہی کا شکار ہوتا ہے لہذا اس معاملے کو شرکت کے لفظ سے ہرگز موسوم اور تعبیر نہیں کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک چیز یہ بھی واضح رہے کہ ادارہ بنک کو اپنے کھاتہ داروں کو نائب اور وکیل تجارت سمجھنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ بنک کا ادارہ اپنا ایک مستقل قانونی وجود رکھتا ہے جس کے اپنے اصول وضوابط اور قواعد و قوانین ہیں جن کے مطابق وہ اپنے امور و معاملات طے کرتا اور اپنی گاڑی چلاتا ہے وہ کھاتہ داروں کی مرضی کا پابند نہیں بلکہ کھاتے دار اس کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں۔ اور پھر بنک کی بجائے خود اپنی بھی ایک مستحکم مالی پوزیشن ہوتی ہے۔ لہذا وہ کسی طرح اس شخص کی مانند نہیں ہو سکتا جو تجارت میں کسی کا نائب اور وکیل ہوتا ہے۔ کتب فقہ میں نیابت و وکالت کی حقیقت اور اس کے ارکان و شرائط وغیرہ کے متعلق جو تفصیل ہے اس کے مطابق بنک کا یہ ادارہ، نائب اور وکیل کی تعریف میں نہیں آتا۔

مثلاً ایک وجہ یہ ہے کہ تجارت میں نائب اور وکیل کے پاس جو مال ہوتا ہے وہ قرض کے طور پر نہیں بلکہ امانت اور ودیعت کے طور پر ہوتا ہے۔ جب کہ بنک کے پاس کھاتہ دار کا مال بطور قرض ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تجارت میں جو کسی کا نائب اور وکیل ہوتا ہے وہ اپنے تصرفات میں اس کی ہدایت اور مرضی کا پابند ہوتا ہے۔ جو اسے اپنا نائب اور وکیل مقرر کرتا ہے۔ جب کہ بنک اپنے کھاتہ دار کی ہدایت اور مرضی کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی مرضی اور اپنے اصول و قواعد کا پابند ہوتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ نئے مجوزہ نظام بنک کاری میں بنک کا جو معاملہ اپنے کھاتہ داروں کے ساتھ یا جو معاملہ اپنے کاروباری قرضداروں کے ساتھ تجویز کیا گیا ہے نہ شرعی طور پر مضاربت کا معاملہ ہے اور نہ شرکت کا معاملہ۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اپنے اجزاء ترکیبی اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربوٰہی کا معاملہ ہے لہذا اس معاملے کی بنیاد پر استوار کیا ہوا نظام بنکاری ہرگز اسلامی نظام بنک کاری نہیں ہو سکتا۔ اسے اسلامی نظام بنک کاری کہنا اسلام کو بدنام کرنا اور اس کے تقدس کو نقصان پہنچانا ہے۔

حضرات علماء کرام کی اطلاع کے لئے یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس نئے متبادل نظام بنکاری میں علاوہ اس معاملہ کے جس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے بنک کے لئے سرمایہ کاری کے چند اور طریقے اور معاملے بھی تجویز کئے گئے ہیں جن کی تفصیل بلا سود بنکاری سے متعلق رپورٹ میں پیش کی گئی ہے۔ اور جن کے مطابق آئندہ یہ بنک سرمایہ کاری کرے گا۔ جیسے پٹہ داری وغیرہ کے طریقے۔ ان میں سے کچھ کے متعلق ان مجوزین حضرات نے لکھا ہے کہ یہ غیر مسلم مغربی ماہرین اقتصادیات کے تجویز کردہ ہیں۔ اور فرانس، جرمنی اور جاپان وغیرہ میں ان طریقوں پر عمل درآمد بھی ہو چکا ہے

لیکن چونکہ ہمارے نزدیک سرمایہ کاری کے یہ طریقے شریعتِ اسلامی کے خلاف نہیں لہذا مجوزہ اسلامی نظام بنکاری میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

سرمایہ کاری کے ان طریقوں کے بارے میں جہاں تک میرے مطالعے، تجربے اور تحقیقی جائزے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں ان میں سے ہر طریقہ اپنے اندر ربوٰ و سود کا عنصر لئے ہوئے ہے۔ لہذا غیر اسلامی اور ناجائز و طریقہ ہے۔ ان کو شریعت اسلامی کے مطابق کہنا دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے جو ہمارے ماہرین اقتصادیات کے ذہنوں میں ربوٰ و سود کے متعلق پائی جاتی ہے

سرمایہ کاری کے یہ طریقے درحقیقت ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہیں جو نظام سرمایہ داری کو صحیح اور سود اور بالخصوص تجارتی نوعیت کے قرضوں پر سود کو اصولاً جائز سمجھتے ہیں اور سرمایہ کاری کے یہ طریقے انہوں نے سود سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ مروجہ شرح سود سے کچھ زیادہ حاصل کرنے کے لئے ایجاد کئے ہیں۔

اسلام نے جس معاشی ظلم و حق تلفی کی وجہ سے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔ سرمایہ کاری کے ان طریقوں میں اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غور سے دیکھا تو ان کے اندر وہ قرض موجود ہے جو نفع کو کھینچتا ہے اور ان کی موجودگی میں وہ معاشی حالات معاشرے میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتے جو اسلام اپنی معاشی تعلیمات کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اسلام یہ چاہتا ہے کہ قومی ثروت صرف چند اغنیا، مالداروں کے درمیان ہی نہیں بلکہ قوم کے تمام افراد کے درمیان گردش کرے اور یہ کہ ملکی وسائل دولت اور ذرائع پیداوار پر ایک محدود طبقے کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔ بلکہ سب کے لئے ان سے فائدہ اٹھانے کا آزاد موقع ہو۔ اور یہ کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بھی میسر ہوں۔ اور ہر ایک کے لئے معاشی ترقی کا بھی آزاد اور مساوی موقع ہو آگے اس کی مرضی کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ جب کہ سرمایہ کاری کے مذکورہ طریقے ایسے ہیں کہ ان پر جس معاشرے میں عام طور پر عمل ہو اس کے اندر قومی دولت اور وسائلِ دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹنا اور ذرائع پیداوار پر چند لوگوں کی اجارہ داری قائم ہونا لازمی اور قدرتی امر ہے۔ اسی طرح ایسے معاشرے میں ایسا غیر فطری قسم کا معاشی عدم توازن ظہور میں آنا ایک فطری بات ہے جس سے گوناگوں برائیاں جنم لیتی اور پورے معاشرے کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اور وہ پائیدار امن و سکون کسی کو نصیب نہیں ہوتا جو اسلام چاہتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس پر تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام کا اتفاق ہے کہ شریعتِ اسلام کا حقیقی ماخذ و اصل سرچشمہ قرآن و حدیث اور کتاب و سنت ہیں اور یہ کہ زندگی کے ہر مسئلہ کے لئے قرآن و حدیث میں تفصیلی یا اجمالی ہدایت موجود ہے۔

اجمالی ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ہر شعبہ زندگی سے متعلق ایسے اصول کلیہ بتمام و کمال

موجود ہیں۔ جن کی روشنی میں ہر نئے جزوی مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ جائز ہے یا ناجائز، اگر جائز ہے تو کس درجہ کا اور اگر ناجائز ہے تو کس درجہ کا۔

لہذا مسئلہ زیر بحث کا شرعی حکم جاننے اور اس کی حیثیت متعین کرنے میں فقہی سواد کے ساتھ ان اصول و مبادی کا بھی ضرور لحاظ رکھا جائے جو معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق قرآن وحدیث میں ہیں اگر فقہی آرا و اقوال میں اختلاف پایا جاتا ہو تو اس رائے اور قول پر اعتماد کیا جائے جو قرآن وحدیث کے اصول و مقاصد سے واضح مطابقت رکھتا ہو۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ استدلال میں کسی فقہی جزیے کلیے کو پیش کرنے کے بجائے قرآن وحدیث کی وہ نص پیش کی جائے جس سے وہ جزیہ کلیہ اخذ کیا گیا ہے۔ تاکہ ذہنوں پر قرآن و حدیث کی عظمت قائم ہو اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ دلوں میں ابھرے۔ نیز مسلمانوں کے اس بلند بانگ دعوے کا ثبوت فراہم ہو کہ قرآن و حدیث میں حیات انسانی کے ہر مسئلہ کے متعلق ہدایت اور روشنی موجود ہے ۔

وضو قائم رکھنے کے لئے جوتے پہننا بہت ضروری ہے ہر مسلمان کی کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کا وضو قائم رہے۔

سروس انڈسٹریز

پائیدار۔ دلکش۔ موزوں اور واجبی نرخ پر جوتے بناتی ہے

Servis

سروس شوز

قدم قدم حسین قدم قدم آرام